ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

اَدب اور علوم

ادب کے علوم کے تعلق کے سلسلہ میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ علم و ادب میں کیا بنیادی تعلق ہے۔ دونوں میں بنیادی اشتراک یہ ہے کہ دونوں زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ادیب اور عالم دونوں مبصر حیات ہوتے ہیں۔ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی عقل اور نظر کے مطابق اس کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مگر ادیب تخیل سے کام لے کر اپنے تجربہ حیات کی ایک تخلیق پیش کرتا ہے جو حیات سے بالکل موافق ہوتی ہے۔ عالم اپنے تجربے کی تحلیل کرتا ہے اور ان کو کلیات اور نظریات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عالم اور ادیب کا فرق ارسطو اور افلاطون کا فرق ہے افلاطون نے ایک عینی جمہوریہ کا نقشہ پیش کیا۔ ارسطو نے وہ سب اصول اخذ کیے جن پر اب جمہوریہ کی بنیاد اسے نظر آئی۔ افلاطون نے سقراط کو محبت کرتے ہوئے دکھایا۔ ارسطو نے اس سے علم منطق بنا لیا جس میں محبت کے حصّے اور ان حصوں کے حصے الگ الگ کر کے ہر حصہ کی تعریف کی۔ اس کی مثالیں دیں اور اس طرح عقل کی بنائی ہوئی ایک پوری عمارت کھڑی کر دی۔ اسی طرح یونانی ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے تخلیق کیے اور ارسطو نے ان کے اصولوں کو جمع کر کے بوطیقا بنا دی۔ اسی طرح اخلاقیات، سیاسیات، مذہبیات وغیرہ کے الگ الگ علوم بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے کائنات کا علم حاصل کرنے کا پہلا ذریعہ ادبی ہی تھا۔ انسانی تاریخ کی سب سے پہلی تصانیف جو ہیں وہ ہومر کی نظمیں ہی ہیں۔ ان میں مذہب بھی ادبی ہی ہے یعنی کائنات کی عظیم طاقتوں کو بھی اصنام کی شکلیں دے کر پیش کیا گیا ہے۔ ہیلنک لوگ زبردست تخیل کے مالک تھے اور یہ تخیل ہی ان کے تمام عمل کا رہنما تھا۔ سقراط پہلا شخص تھا جس نے ذہنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اسی لیے اس کے بابت یہ کہا جاتا ہے

کہ وہ فلسفے کو آسمان سے زمین پر لایا - افلاطون کی تصانیف بنیادی طور پر ادبی ہیں - مگر ان میں سقراط کے وجود نے علمی جزو کا اضافہ کر دیا ہے - ارسطو نے ان علمی اجزا کو بالکل الگ کر لیا اور علوم کی بنیاد رکھی - علم اور ادب کے دو الگ الگ دائرے ہو گئے - جو عرصے بعد بالکل الگ الگ ہو کر نمایاں ہوئے - ایک حد تک افلاطون نے ہی ادیب کو علمی دنیا سے الگ کر دیا تھا - کیونکہ اس کے حساب سے ادیب محض قیاس آرائیاں کرتا تھا اور اس لیے محض عکسوں کا پجاری تھا - مگر ارسطو نے یہ واضح کیا کہ شاعر جن عکسوں کو سامنے لاتا ہے وہ بھی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں - لہٰذا شاعری کو بھی ایک قسم کا علم مان لینا چاہیئے - اصل میں عالم اور ادیب کو بالکل الگ کر دینا مشکل ہی رہا -

افلاطون نے علم کا نام فلسفہ رکھا تھا اور اس کو ادب کا متضاد ٹھہرایا تھا - مگر ادب اور فلسفے کا تعلق اہم رہا - عام لوگ ہومر کے ساتھ ساتھ سقراط کو بھی اہم مانتے رہے - بہترین شاعر فلسفی بھی مانا گیا اور بہترین فلسفی کو شاعر بھی کہا گیا - ساتھ ہی ساتھ وہ پست شاعر جو اپنے توہمات ہی کو پیش کرتے تھے محض شاعر کہے جاتے اور اسی وجہ سے شاعر فلسفی متضاد بھی مانا گیا - افلاطون کا شاعر سے جو کچھ مطلب تھا اس کے دائرے میں وہی شاعر آتے تھے جن کو فلسفے سے نہیں بلکہ حسین الفاظ میں بے تکان باتیں بنانے سے سروکار تھا - غرض ایک سطح پر شاعری اور فلسفہ یا علم کو ایک ہی چیز مانا گیا اور دوسری سطح پر دونوں کو متضاد کیا گیا -

اس کے بعد پیغمبروں کا دور آیا - پیغمبر روح القدس سے تعلق رکھتے تھے - جس کو عقل کل بھی کہا گیا ہے اور جس کو بلیک نے قوتِ تخیل سے تعبیر کیا ہے ان کو بھی عام لوگوں نے پہلے پہلے شاعر ہی کہا اور اس بنا پر انھیں ماننے سے انکار کر دیا - ان کی باتوں کا انداز شاعرانہ ضرور تھا مگر جو باتیں انھوں نے کہیں وہ ایک طرف بڑے گہرے فلسفی نکتے رکھتی تھیں اور دوسری طرف عمل صالح کی ہدایت کرتی تھیں - ان کی ہدایت سے شاعر کی بھی اصلاح ہوئی اور شاعری ان کے علم کی ترجمان ہو گئی - مذہب اور شاعری میں تعلق اصناعی مذہب کے دور سے ہی چلا آتا تھا کیونکہ جو اصنام ہومر سے پہلے مانے جاتے تھے وہ شاعرانہ تخلیق بھی تھے اور مذہبی عقاید کے حامل بھی تھے -

عقلمندی کی دیوی منروا ایک حسین اور شاندار عورت تھی جو ڈھال اور تلوار سے مزین تھی اور پھر اس کی ہر ادا دانشوری کے صفات کو بھی ذہن میں لاتی تھی۔ پیغمبروں کے مذاہب نے اصنام کو توڑا اور اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ مذہب کا اہم جزو اخلاقیات ٹھہرا، اور شاعری اخلاقی ہو گئی۔ قصائد میں اعلیٰ مرتبہ اور اعلیٰ اخلاق والے لوگوں کی مبالغہ آمیز تعریف شاعری کے اخلاقی مذہب سے متاثر ہونے کی مثالیں ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں مذہب کو قوانین فقہ میں تبدیل کیا گیا۔ اور دینیات کا علم وجود میں آیا۔ یہ تمام شاعری پر حاوی رہا۔ اور اس میں دب کر شاعری پہلے فنا ہو گئی۔ مگر پھر مذہبی شاعری کا جامہ پہن کر آئی۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں ہم کو مغرب میں دانتے نظر آتا ہے جس کی "ڈیوائن کمیڈی" عیسائیت کا مکمل اور کامل تصوّر پیش کرتی ہے۔ اور مشرق میں مولانا روم کی مثنوی ہے جس کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ "ہست قرآن در زبان پہلوی" یہاں پہنچ کر علم مذہب اور شاعری ایک ہو جاتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کو علم اخلاق کا دور کہنا چاہیئے۔ اور اس دور کی شاعری تمام تر تمثیلی ہے۔ اخلاقی اصولوں کو خوب صورت زبان میں نظم کر دیا جاتا ہے یا قصّے سُنائے جاتے ہیں تو اخلاقی قدروں کی تشخیص ان میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محض غنائی یا محض تخیلی شاعری بھی رائج ہے اور دیو و پری کے افسانے بھی عام ہیں جن کو اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر زیادہ اہم اخلاقی ادب ہی ہے چاہے اخلاق اس پہ اس قدر حاوی ہو کہ شاعری دب کر ہی کیوں نہ رہ جائے۔ آگے چل کر ادب اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہوتا گیا۔ مگر اخلاقی اثر کی شاعرانہ اثر سے ہم آہنگی اعلیٰ ادب کا طرہ امتیاز رہی اور آج بھی ہے۔ انیسویں صدی میں رسکن نے یہ بتایا کہ کامل حسن کامل نیکی کا ہی ایک پہلو ہے۔ حسن، حق ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ دو مدرسۂ خیال ہو گئے جن میں سے ایک ادب برائے ادب، اور ایک ادب برائے برائے اخلاق کا قائل تھا، مگر آخر کار نتیجہ یہی نکلا کہ اعلیٰ ترین ادبی چیز کا اثر اخلاقی ہونا لازمی ہے۔ آج بھی ٹی۔ ایس ایلیٹ کی یہ رائے ہے کہ شاعرانہ تجربہ، مذہبی یا اخلاقی تجربہ

اور شاعر کو بوجہ دائمی قدروں سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ شاعرانہ قدروں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ یونانی ادب کا بھی اثر اخلاقی ہی تھا۔ ارسطو نے ٹریجیڈی کا اثر جو کتھارسس یا تزکیہ بتایا ہے، وہ جمالیاتی اثر کے ساتھ ساتھ اخلاقی اثر بھی ہے۔

سترھویں صدی سے سائنس کی ترقی ہوئی۔ فلسفہ بھی سائنس کے ماتحت آیا اور منطق کو بھی بجائے کلیتوں کے تجربوں پر مبنی کیا گیا۔ فلسفہ کی شاخیں ہونے لگیں اور مختلف قسم کے علوم وجود میں آنے لگے۔ یوں تو علوم کی شاخیں ارسطو ہی نے الگ الگ کر دی تھیں۔ مگر اب تک ایک ہی شخص تمام علوم کا مالک ہو سکتا تھا۔ مگر اب الگ الگ علوم کی صاف صاف حد بندیاں ہوئیں۔ صنعت اور حرفت کے عروج نے سیاسیات، اقتصادیات اور سماجیات کے علوم کو اہمیت دی اور ان کے الگ الگ مفکر وجود میں آئے، فلسفہ اور اخلاق کے بجائے سماج اور سوسائٹی مرکز توجہ ہوئی۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تنقید عام ہوئی، ادب میں واقعیت آ گئی جو اس کے سماجی علم سے متاثر ہونے کی مثال ہے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کی شاعری زندگی کے تمام پہلوؤں پر طنز کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ قصہ گوئی ناول میں تبدیل ہوئی اور ناول کے موجد فیلڈنگ نے اپنے فن کو سماجی تاریخ کہا۔ محض تفریحی ادب بھی چلتا رہا۔ مگر اہم ادب وہی ٹھہرا جس میں تنقید حیات ہو۔ انیسویں صدی کا تمام ادب علم سماجیات کی شاخ ہے اور اس صدی کے اہم ترین نقاد نے شاعری کی یہ تعریف کی کہ وہ تنقید حیات ہے۔

اس نظریہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو جدید سیاسی اور سماجی مسائل سے سروکار ہو گیا اور ادب کی ایک شاخ وجود میں آئی جسے صحافت کہا گیا۔ عام آدمی کے ادب اور صحافت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ مگر ادب کا سچا مذاق رکھنے والوں نے دیکھا کہ صحافت کو محض وقتی قدروں سے تعلق ہے جب کہ ادب ہمیشہ دائمی قدروں پر مبنی رہا۔ دائمی قدریں وہی آفاقی یعنی فلسفی یا اخلاقی قدریں تھیں۔ جن کو یونانی زمانے سے مانا جاتا تھا۔ مگر مارکیت نے ان قدروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ادب سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ ٹھہرا

اور اب بھی اس نظریہ کو ماننے والے ادیب کو سوشل سائنس کا عالم سمجھتے ہیں۔ ادب اپنے زمانے کی سوشل تاریخ پیش کرتا ہے اور اس کا وجود سوشل رحجانات سے ہوتا ہے۔ ادیب وہی بہتر ہے جو سوشل حالات سے واقف ہو۔ ایک حد تک اسے سوشیالوجی کا عالم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سوشل حالات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کا مطالعہ بھی ضروری ہوا۔ ادب کو نفسیات انسانی کے مطالعہ کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اور ادب علم نفسیات سے متعلق ہو گیا۔ ڈراموں میں ہمیشہ سے کردار اہم ترین چیز سمجھے جاتے تھے۔ یونانی ڈرامے اپنے ہیروؤں کے نفسیاتی عالم کی بنا پر زندہ ہیں۔ عہد الزبتھ کے انگلستان میں ڈرامہ کا مقصد زندگی کے سامنے آئینہ رکھنا ہوا۔ چنانچہ شیکسپیر کے ڈراموں میں کردار انسانی کے مطالعے نظر آئے۔ آگے چل کر شاعروں اور ناول نگاروں نے رائج نفسیاتی نظریات کے مطابق زندگی کی ترجمانی کی۔ مثلاً انیسویں صدی میں ہار ٹلے کا یہ نفسیاتی نظریہ عام ہوا کہ بچے میں ہر اس قسم کی صلاحیت پیدائشی ہوتی ہے جو کسی انسان میں بلوغ پر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ورڈزورتھ نے کہا CHILOIS THE FATAER OF THE MAN اور اپنی نظموں میں بچپن کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ ڈکنز نے اپنی ناولوں میں جو بچوں کے کردار نمایاں کیے ان میں بالغ انسان کے تمام جذبات دکھائے۔ جدید ادب کو نیا رنگ دے رہے ہیں فرائڈ کی جنسی نفسیات کی نظر سے زندگی کو دیکھنے کی بنا پر ڈی۔ ایچ لارنس کی ناولوں میں جو کردار کی انفرادیت نمایاں کرنے کے بجائے ان کے شعور کا عالم ایک دھارا کی طرح چلتا ہوا دکھاتے ہیں تنقید بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے ادب پاروں میں تحلیل ہو گئی ہے۔ ادب کا کام نفسیاتی نظریوں کو زندگی میں کارفرما دکھانا ہے

اس وقت ہر علم کی لاکھوں شاخیں ہو گئی ہیں اور ہر شاخ کی بابت اتنا علم ہے کہ ایک شخص ایک ہی شاخ کے مطالعہ میں اپنی ساری زندگی صرف کر دیتا ہے۔ ہر شاخ کا ماہر الگ اور دوسری شاخ کے ماہر سے بالکل مختلف نظر آتا ہے، علوم ہمارے سماجی ورثہ کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ہر علم

سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کیے بغیر کسی شخص کا انسانوں میں شمار نہیں ہوسکتا۔ ہر شخص کے لیے ہر علم کی بابت کچھ نہ کچھ اور کسی ایک علم کی بابت سب کچھ جاننا ضروری ہے۔ یہ تعلیم یافتہ ہونے کا معیار ہے تعلیمی نظام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ادیب کا گریجویٹ ہونا لازمی ہے۔ برنارڈ شا وغیرہ گریجویٹ نہیں تھے۔ مگر ان کو ہر سیاسی، سماجی اور نفسیاتی نظریہ کا علم ضرور تھا۔ علوم کی ترقی کی بنا پر انسان ارتقاء کے جس درجہ پر پہنچا ہے اس تک ادیب کا پہنچنا لازمی ہے ورنہ اس کا ادب پست اور سطحی کہلائے گا۔ اگر وہ زندگی کے سیاسی پہلو میں دلچسپی رکھتا ہے تو سیاسیات کے تمام اہم نظریات سے اس کی واقفیت ضروری ہے۔ اگر وہ اقتصادی امور سامنے لانا چاہتا ہے تو اس کی زندگی کا نقشہ ہرگز اہم نہ ہوگا جب تک کہ وہ اقتصادی نظریات سے پوری واقفیت کے ساتھ اسے واضح نہ کرے۔ سب سے زیادہ ادیب کو نفسیات کے علم سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ انسانی کردار وہ اہم ترین نقطہ ہے جس پر اس کی نظر سب سے زیادہ جمتی ہے۔

اس تمام جائزے سے جو کتنا ہی سطحی اور سرسری سہی، ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وقیع ادیب ہمیشہ علم کے ساتھ ساتھ چلا۔ ادبی صلاحیت علمی قابلیت سے بالکل مختلف اور بالکل الگ چیز ضرور ہے۔ ادیب علم سے بالکل الگ ہو کر اپنے مخصوص تجربوں کی تخلیق کر سکتا ہے اور کرتا آیا ہے۔ مگر علم کی ترقی انسانی ذہن کو بھی ترقی دے رہی ہے۔ اور کوئی شخص عام ذہن انسان کے دائرے میں لانے کا اہل نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ ہر علم سے کماحقہٗ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ جو ادیب اس ذہنی درجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ ان کی تخلیق محض سطحی اور سنسنی خیز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ان کو ادب کے درجہ سے گرا ہوا شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے ادبی صلاحیت کا علمی قابلیت سے امتزاج ضروری ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ علم کی زیادتی ادب کے حق میں نقصان دہ ٹھہرتی ہے۔ حد سے زیادہ عالم شاعر جیسے ملٹن مخصوص عالموں ہی کے لیے دلچسپ رہ جاتے ہیں۔ جدید دور کے انٹلکچول ادیب زیادہ تر لوگوں کے پلّے نہیں

پڑتے۔ ادیب کا ضرورت سے زیادہ عالم ہونا بھی ادب کے حق میں مضر ہے۔ سنجیدگی، خشکی، ابہام وغیرہ کی سی صفات عالمانہ ادب میں آجانا لازمی ہیں۔ لہٰذا اصل معیار یہ ہے کہ ادیب کو عالم ضرور ہونا چاہیئے مگر علم کو اپنے ادب پر حاوی نہ ہونے دینا چاہیئے۔ بہترین ادب کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک سطح پر وہ عام قاری کی محض دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اور دوسری سطح پر وہ عالموں کو فکر میں ڈالتا ہے۔ اور گہری معنی خیزی کی طرف لے جاتا ہے۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ علم کو بھی عام سطح پر لے آئے۔ اور اگر وہ یہ نہ کر سکے تو اس کو کامیاب ادیب نہیں کہا جا سکتا۔

جدید دور میں ادب بھی تمام علوم سے الگ ایک علم ہو گیا ہے۔ اس کا بھی مطالعہ ہوتا ہے اس کی بھی الگ الگ شاخیں ہیں اور ہر شاخ کا الگ مطالعہ اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے علوم کے الگ الگ شعبوں کا۔ ادب کا شروع سے اب تک جو ارتقاء ہوا اور اس سے جو جو صورتیں وجود میں آئیں ان سے پوری واقفیت ادیب کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً کوئی ادیب ناول نگاری کی طرف رجوع ہے تو اسے ناول نگاری کے شاہکاروں کا صحیح مطالعہ ضروری ہے، ورنہ اس کی ناول نگاری پست درجہ پر ہی رہ جائے گی۔ جب ہم عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری کو دیکھتے ہیں تو فوراً ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جس صنف کو ہمارے ادب میں رائج کر رہے ہیں اس کے لوازمات سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے اسکاٹ کی ناول "ٹیلسمان" ضرور پڑھی اور اسکاٹ کے بیانات اور مکالمے کے طریقوں کو برتنا ضرور سیکھا، مگر جن صفات کی بنا پر اسکاٹ کی ناولیں ناولیں کہی جاتی ہیں۔ ان تک نہیں پہنچے۔ ان کا ناول نگاری پر ایک مضمون بھی نظر پڑا جس میں انھوں نے ایسی بے پر کی اڑائی ہے کہ ان کی کم علمی پر ترس آتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری ناول نگاری بالکل یورپین ناول نگاری کی طرح ہو۔ ہر ملک کی ناول نگاری دوسرے ملک کی ناول نگاری سے مختلف ہے۔ مگر ناول کی ایک بنیادی اور امتیازی صفت ضرور ہے جو تمام دنیا کی ناول نگاری میں مشترک ہے وہ صفت مطالعہ ہی سے واضح ہوتی ہے اور مطالعہ کے بعد ادیب کو یہ طے کرنا ہے کہ آیا اس میں اس صفت کو پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کہ نہیں۔ اگر

عبدالحلیم شرر ناول نگاری کے عالم ہوتے تو اتنی ساری نام نہاد ناولوں کا ڈھیر لگا کر تضیع اوقات نہ کرتے مطالعہ نہ صرف بنیادی صفات سے ہمکنار کرتا ہے بلکہ اچھے اور بُرے کی تمیز بھی سکھاتا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا حالانکہ ان کی امراؤ جان ادا کو مثالی ناول کہا جا سکتا ہے، ناول نگاری کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ انھوں نے سنسنی خیز اور جاسوسی ناولوں کو بھی اسی انہماک سے لکھا جیسے امراؤ جان ادا کو۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ایک کامیابی محض اتفاقی ہے ورنہ ناول کے سلسلے میں وہ کوئی مذاق نہیں رکھتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنی روایات کی شاعری کا علم نہیں رکھتے، وہ اول فول بکنے لگتے ہیں۔ قواعد، عروض، بیان و بدیع کا علم شاعری کیلئے ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس کا عملی درس یوں ہوتا تھا کہ شاعر عرصے تک اپنا کلام کسی استاد کو دکھایا کرتا تھا۔ مگر اب یہ قاعدہ ختم ہو گیا اور ہر جاہل محض موزونی طبع پر ٹیک لے کر جو کچھ چاہتا ہے بک جاتا ہے اور اس کو جاہل لوگ جدت اور نئی شاعری کہتے ہیں۔ ادب پیدا کرنے والے ہی کے لیے نہیں بلکہ ادب سے متاثر ہونے والے کے لیے بھی صحیح علم ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کے پروفیسر جب کسی ناول پر تنقید کرنے آتے ہیں تو کیا اول فول بکتے ہیں۔ مثلاً ایک معروف پروفیسر نقاد نے ایک ناول کی بابت یہ کہا کہ اس میں کردار نگاری نہیں ہے۔ اصل میں وہ ناول زندگی کا نقشہ کردار ہی کے ذریعہ کھینچتی ہے۔ اور اگر اس میں کردار نگاری نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے پھر ان ہی صاحب نے ایک پست ناول کے سلسلے میں جس میں کردار نگاری بالکل نہیں ہے یہ کہا کہ اس میں کردار ہیں۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نہیں جانتے کہ کردار کیا ہوتا ہے اور کردار نگاری کسے کہتے ہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اُردو ادب کا ہماری یونیورسٹی میں جس طرح مطالعہ کرایا جاتا ہے اس سے کردار نگاری کی پرکھ ہو جانا ناممکن ہے جن لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ مراثی میں کردار ہیں یا سر نذیر احمد کے تمثیلی فسانے ناولیں ہیں وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کردار کیسے ہوتے ہیں اور انفرادی نفسیات ادب میں کیسے آتی ہیں۔ اس حالت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب

کا علم بھی کتنی ضروری چیز ہے تاکہ صحیح ذوق ادب پیدا ہو۔

اس کے علاوہ جس علم سے ادب کو اس وقت سب سے زیادہ سروکار ہے وہ علم نفسیات ہے جو اس صدی کا سب سے اہم علم کہلایا جا سکتا ہے اور جو فلسفہ اخلاقیات، سماجیات سائنس غرض کہ ہر مادی اور دینی علم کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ ادب کا مواد زندگی ہے اور اس زندگی کی بابت جیسے خیالات اور تجربات ہمیں نفسیات سے مل رہے ہیں ویسے اب کسی شعبۂ علم سے نہیں ملتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اہم بات ہے کہ آج ہم ہر علم کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں اور جب تک اس نقطۂ نظر کو فرسودہ سمجھا جاتا ہے۔ ادب پر جو تنقید آج کل ہوتی ہے۔ اگر اس کا مقابلہ انیسویں صدی کی تنقید سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اب مابعد الطبیعات کی جگہ نفسیات نے لے لی ہے۔ ادیب اور ادب نواز کو نفسیات کے اہم نظریات سے واقفیت کی ضرورت ہے۔

ادب اور علم کے تعلق کے دو مدارج ہیں۔ ایک وہ جبکہ ادیب ہر علم سے واقف ہو کر اپنے مواد کو اس کے موافق پیش کرتا ہے۔ جیسے جدید دور میں جنسی نفسیات سے واقف ادیب انسان کو تمام تر جنسی محرک کا کرشمہ دکھاتے ہیں۔ یا شعور کی رو کے نقشے پیش کرتے ہیں۔ پرانے زمانے کا عالم ادیب اپنے زمانے کے اہم خیالات کو نظم کر دیا کرتا تھا جیسے ورڈسورتھ نے ہارٹلے کے فلسفے کے مطابق بچوں کے نفسیات کو رقم کیا۔ یا پھر اپنے علم کا انداز تلمیحات کے استعمال سے کیا کرتا تھا۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہوئے جو زندگی کو کتابوں کی عینک سے دیکھنے لگے۔ جیسے مرزا دبیر کو صبح کا سماں اسی صورت میں دکھائی دیتا ہے ؎

فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

وہ شاعر جن کو مابعد الطبیعاتی METAPHYSICAL کیا گیا ہے۔ اپنی شاعری میں ہر مادی اور سماجی علم کے تصورات اس طرح رقم کرتے تھے کہ نزاکت بیان، لطافت معنی تعقید

لفظی اور معنوی اس کے من کا اہم حصّہ ہوگئی تھی - غالب کا مشہور مطلع -

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یا یہ شعر

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب　　پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

عجیب علمی پیچوں میں لے جاتے ہیں - ان پیچوں کے کھولنے کے بعد ان کا شاعرانہ اثر محسوس ہوتا ہے، شاعری علم کا مظاہرہ ہو جاتی ہے - اور محض عالموں ہی کے لیے رہ جاتی ہے - جدید دور میں شاعری بلکہ ہر قسم کے ادب کو اسی طرح پر علمی چیز بنا دینے کی طرف رجحان ہے اور اس لیے ادب سے عام شکایت یہ ہوگئی ہے کہ وہ بھی ایک مخصوص دائرے کی چیز ہوگیا ہے -

دوسرا درجہ وہ ہے جب کہ ادیب علم کا حامل رہتے ہوئے بھی اس دائرے سے بالاتر ہو جاتا ہے - اصل میں ادیب کی کامیابی یہی ہے کہ علم کو اپنے ذاتی تجربے میں اس طرح دکھلائے کہ وہ نہایت عام تجربہ ہو جائے اور اس طرح وہ مخصوص علم سے بالاتر ہو کہ اس علم تک پہونچے جو آفاق کی سیر اس طرح کراتا ہے کہ جاہل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور عالم اس پر سر دھنے اس کی بہترین مثال گوئٹے کی شاعری ہے، اس کی اہم تخلیق مفسٹوفلیس کو دیکھیے جو ایک ایسے ڈرامے کا کردار ہے جو عام طور پر بہت مقبول ہے - مفسٹوفلیس اپنی حرکتوں اور باتوں سے ہر شخص کو متاثر کرتا ہے اور بنیادی طور پر مضحک کردار ہو جاتا ہے - مگر غور سے دیکھا جائے تو فلسفۂ اخلاق نے جو جو صفات بھی بدی یا شر سے وابستہ کی ہیں وہ سب اس کے کردار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں اس کردار کو بدی یا شر پر ایک مکمل مقالہ بھی کہا جا سکتا ہے وہ بدی یا شر کے فلسفہ کا نچوڑ ہے مگر ہر پستی، ہر مکاری، ہر شر اور ہر حماقت اس کے کردار میں اس طرح مل کر ایک قدرتی کل بن گئی ہیں کہ وہ فلسفہ کی بجائے تخلیقی یعنی جیتی جاگتی چیز ہوگیا ہے - اس طرح ادبِ عام کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اس سے بالاتر ہوگیا ہے اور ظاہری طور پر دلچسپی ہی کی چیز رہا ہے - ادیب اور ادب نواز کا عالم ہونا ضروری ہے مگر یہ بھی لازمی ہے کہ ادب علم سے بالاتر نکل جائے - اصل

میں علم کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو زندگی کو محدود ہی کر دیتا ہے۔ ادب اسے اس کے محدود دائروں سے نکال کر آفاقی بناتا ہے۔ یہی ادب کا کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تخلیق تمام علوم کو گھیر لیتی ہیں۔ یہ یقین ہے کہ شکسپیر کسی طرح عالم نہیں کہا جا سکتا، مگر اس کی تخلیقوں میں تمام علوم نکال لیے گئے ہیں، یہاں تک کہ شکسپیر کے علم نباتات اور علم حیوانات تک پر کتابیں لکھ دی گئی ہیں اور ماہرین نفسیات تو اس کے کرداروں کی باتوں سے نامعلوم کتنے نظریے اخذ کر لیے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ آفاقی شاعر تمام علوم سے واقف ہوتا ہے۔ نہیں وہ اس مقام پر ہوتا ہے جہاں سے تمام علوم کا مخرج ہے وہ ان آفاقی قدروں سے تعلق رکھتا ہے جن سے تمام علوم کی الگ الگ قدریں معلوم ہوئی ہیں۔ اس کے نقشے سے محض تفریح بھی لی جا سکتی ہے اور پھر اس کو ہر نظریہ سے واضح بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر مذہب والا اسے اپنے مذہب پر بہر و ثابت کر سکتا ہے۔ ہر سیاسی نظریہ اس کے یہاں پورا اترتا ہے۔ اور انسانی زندگی کا ہر پہلو اس کے یہاں سامنے آتا ہے۔ ادیب کا مقام اس معنی میں تمام عالموں کے مقام سے اعلیٰ ہے۔ ادیب جو بات کہتا ہے وہ ایسی ہوتی ہے کہ اس کو جتنے اور جیسے معنی پہنائے جائیں ویسے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب یہ کہا کرتے تھے کہ غالب نے ہر بات کی پیشین گوئی کر دی ہے۔ جب تقسیم ہند وجود میں آئی تو ان سے پوچھا گیا اس پر بھی غالب نے کچھ کہا تھا تو انھیں نے شعر پڑھا ؎

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا ۔۔۔۔ واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غور کیجیے تو یہ اس فطری رجحان کی بنیاد پر پہنچتا ہے جو تقسیم کی محرک ہوئی۔ تکرار تمنا میں غالب نے اس دائمی اور آفاقی حقیقت کو بند کر دیا ہے جو ہر سیاسی کش مکش پر چاہے وہ قومی ہو یا صوبہ جاتی، یا پارٹی بندی کی عائد کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ ذاتی کش مکش کے لیے بھی لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں غالب اور اقبال کے اشعار جن جن موقعوں پر اقتباس کیے جاتے ہیں ان کا ان شاعروں کو خیال تک نہ آیا ہوگا۔ مگر یہ شعر حقیقت میں ادب ہیں۔ کیونکہ ان کے معنی کا احاطہ اتنا آفاقی ہے کہ ہر علم اور ہر قدر داں میں سما جاتی ہے۔

جدید دور میں سیاسی قدروں کے زور نے اور علوم کی طرف حد سے زیادہ رجحان نے ادب کو محدود کر دیا ہے۔ مثلاً ویلز کی ناولوں اور شاؤ کے ڈراموں میں یا اشتراکیت کی طرف مائل لوگوں نے افسانوں اور نظموں میں سماجی حالات سے اور سماجی نظریات سے گہری اور وسیع معلومات کا ثبوت ملتا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تخلیقات نظریہ تک ہی محدود ہو گئیں۔ اور نظریہ سے باہر اُن کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔ علم کی زیادتی کی وجہ سے ادب صحافت کے درجہ پر اُتر آیا۔ کردار سماج اور سماجی رجحانات کے نمائندے ہوئے مگر آفاق کے نہیں۔ وہ نظریات کے ادا کرنے والے ہوئے مگر انسان نہ رہے۔ اس وقت آفاقی شاعروں کی کمی کی وجہ یہی ہے کہ شاعر آفاق میں گم ہونے کے بجائے مسائل میں گھر گیا ہے۔ زندگی کے وہ پہلو جو علوم دکھاتے ہیں ان کی سطح ہی پر تیر رہا ہے۔ اس کے نیچے چھپے ہوئے آفاقی پہلوؤں میں غوطہ زن نہیں ہو پاتا۔ یہ ایک کلیہ تھا کہ جو جو علم بڑھتا جائے گا وہ وہ شاعری کم ہوتی جائے گی۔ آج اس کے معنی ہمیں یہ سمجھ میں آ رہے ہیں کہ علوم شاعری کو دیمک کی طرح کھا رہے ہیں اور ان آفاقی قدروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ جن پر ہی پرانے ادوار کے عظیم شاعر ٹیک لیے ہوئے تھے۔

ادب تمام کائنات اور ہر ذرّہ کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھتا ہے جبکہ علوم اسے زیادہ سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان معنوں میں ادب علوم کا متضاد ہے اور مذہب ہمنوا ہے، مذہب کی بابت کچھ عرصہ ہوا کہ یہ نظریہ رائج تھا کہ جن جن چیزوں سے مذہب کو سروکار ہونا تھا وہی سب الگ الگ کر کے علوم بن گئے ہیں اور کیونکہ ہر علم پر اتنی زیادہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں کہ مذاہب کی بتائی ہوئی چند باتیں گرد نظر آتی ہیں۔ اس لیے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جو شخص جس معاملے کی بابت ہدایت چاہے وہ اسی معاملے کے متعلق علم سے لے لے۔ مگر جنگ عظیم کے بعد محسوس ہوا کہ علوم کوئی چیز نہیں ہیں جب تک کہ انسانیت پر عقیدہ نہ ہو۔ اور انسانیت کا ہر عقیدہ مذہب ہی سے حاصل ہوتا ہے یا پھر ادب سے، اس لئے جدید ادب میں مذہب اور ادب کا رشتہ مضبوط کیا گیا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے یہاں تک کہا کہ شاعری بھی ایک مذہبی رسم

ہے اور اس نے اپنی شاعری کو ایسا بنا کر بھی دکھا دیا کہ مذہب اور شاعری ایک نظر آئے، شاعر کا کام بھی پیغمبروں کی طرح آفاقی قدروں تک پہنچنا ہے۔ اور اس لیے جدید ادب محض اپنے مذہب ہی سے نہیں بلکہ تمام عظیم مذاہب سے خیالات اور اشارات لے کر اپنے فن کی تعمیر کرتا ہے یورپ میں کچھ مخصوص اثرات کی بنا پر ہندو مت اور بدھ مت ادیبوں کے مواد کا اہم حصّہ ہو گئے ہیں۔ اور وہ مذہبی روایات اور رسمیں جو عوام میں رائج تھیں اور عیسائیت کے متضاد تھیں ادیبوں کے عقاید شامل ہو کر ان کو نئے اشارے دے رہی ہیں۔ مذہبی عقائد کی روشنی اس وقت ادب کو روشن کر رہی ہے۔

بہرحال ادب اور علم کا تعلق چاہے وہ کسی وقت کسی مخصوص علم سے ہو یا آفاقی علم سے ہو۔ ایک حد تک لازمی چیز ہے بغیر علم کے گودے کے ادب محض چھلکا ہی چھلکا رہ جاتا ہے علم ادبی تصوّرات کو خیال کی مستحکم بنیاد پر ایستادہ کرتا ہے اور محض تخیلی کھیل کو آفاقی قدروں کا دقیع کھیل بنا دیتا ہے۔ محض سنسنی خیز اور محض فرضی چیزیں پُر مغز اور پر معنی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر کا ہیملٹ ایک پریشان شاہزادہ ہی نہیں ہے جو اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ بلکہ انسانی ذہن کی اس کش مکش کا بھی عالم ہے جو علم کی زیادتی اور عمل کی کمی سے ظہور میں آتی ہے یہ مطلب نہیں کہ ہیملٹ ادبی تخلیق کی بجائے فلسفی خیال ہے۔ اصل میں تو شیکسپیئر کے ڈرامہ دیکھنے والے سنسنی خیز انتقام کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور شیکسپیئر نے ان کی محض سطحی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ مگر اس کے گہرے علم نے ایک سطحی چیز ہی میں وہ وقعت پیدا کر دی کہ ماہر نفسیات اسے بڑے گہرے معلومات کا انکشاف سمجھتے ہیں۔ علمی بنیاد ہی پست ادب کو اعلیٰ بنا دیتی ہے اور صاحبان ذوق کے لیے سرمایہ دلچسپی بہم پہنچاتی ہے۔ جدید دور کے اشاریاتی ادب کو اس کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے۔ پروست کی عظیم ناول کے پس منظر میں برگساں کا فلسفۂ زمان ایک ایسے کرشمہ کی طرح موجود ہے جو کائنات کی دلچسپ اور آفاقی حقیقت ہے۔

ورڈسورتھ نے شاعری کو وہ پُرجذبات اظہار بتایا تھا جو ہر علم کے چہرے کی زینت ہے اصل میں شاعر یا ادیب کا عالم ہونا ضروری ہے۔ کم از کم اپنے تجربے کے دائرے کی چیزوں کا علم اگر اسے نہیں ہوگا تو اس کا کلام پست ہی رہ جائے گا۔ ہمارے یہاں شاعر کو جاہل اور جھوٹا ہی جانا گیا۔ آتش نے کہا تھا ؎

آتش بُرا نہ مانیو حق جو پوچھیو! شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

اور جب اقبال ایسا شاعر ظہور میں آیا تو اس کو فلسفی کہا گیا۔ اور اب بھی زیادہ تر اُن کے فلسفہ ہی پر زور دیا جاتا ہے۔ اصل میں وہ شاعر ہیں اور شاعر ہی ہیں۔ وہ شرق اور غرب کے تمام علوم سے واقف ہیں۔ مگر ان کا کام ان علوم میں وہ روشنی پیدا کر دیتا ہے جو اس کے جذباتی پہلو کو سامنے لاکر انھیں والوں کے دلوں تک پہنچا دے۔ ان کی مخصوص قابلیت یہ ہے کہ وہ ہر علم کے چہرہ کو زینت بخش دیتے ہیں۔ ان کے شعر ہمیں آفاق کی گہرائیوں اور اونچائیوں میں لے جاتے ہیں۔ اور پھر بھی شعر رہتے ہیں۔ وہ عقل کو فلسفیوں کے حوالے کر کے محض جذبات پرست اور جذبات پر اظہار کرنے والے نہیں رہ جاتے، وہ جانتے ہیں اور ہمیں محسوس کرا دیتے ہیں کہ

عقل خود بیں دگر و عقل خدا بیں دگر ست بال بلبل دگر و پنجہ شاہین دگر ست

ان کی نگاہ تمام علوم پر تنقیدی ہے مگر ہر علم کی روح کو نکال کر وہ ایسے الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں جو ہمیں اپنے راگ سے اسی طرح لے اُڑتے ہیں جیسے کوئی ہوائی جہاز اپنے اڈے سے پرواز کرے۔ شاعری علم میں ایک روح پھونکنے کا ذریعہ ہے اور اس درجہ کی شاعری پر ہماری روایات میں رومی، عرفی، غالب اور اقبال ہی ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لیے ایک عجیب علم کا ذریعہ ہے۔ جس کو بصیرت کہا جائے۔ یورپ کے عظیم شاعروں کا طرۂ امتیاز یہی رہا ہے کہ وہ علوم کے بابت عام قاری کی بصیرت بڑھاتے ہیں۔ وہ ہمیں اس دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں اعلیٰ ترین عالم پہنچے ہیں اور اس دنیا کی روح سے ہم کنار کرتے ہیں۔ کائنات کی بابت جو کچھ ہمیں مختلف علوم بتاتے ہیں وہ بحثوں اور الجھاؤں میں ہی رہ جاتا ہے اگر شاعر ان کو تخیلی رنگ

دے کر ایک نئی زندگی نہ بخشتے، مثلاً گوئٹے کے "فواسٹ" کی پہلی اٹھائیس سطریں جن میں میکائیل، جبرئیل اور اسرافیل خدا کے حضور میں گیت گاتے دکھائے گئے ہیں۔ پوری کائنات کے اصولوں سے ہمیں واقف کر دیتے ہیں جیسے کوئی فلسفی نہ کر سکا۔ حالانکہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ فلسفیوں ہی سے ماخوذ ہیں: فرشتوں کے گیت میں سطور دہرائی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

DGR ANBLI CL GIBT DEN ANGLN STAR KG

DAKEINER DICH URGR UNOBN MRG

UND ALLGS DEINE HOHEN WERK

SIND HERRLISH WIE AM ERSTEN TRG

تمام دینیات اور فلسفہ کا نچوڑ ان سیدھی سادی لائنوں میں اس زور کے ساتھ آگیا ہے کہ پڑھنے والے کے ساتوں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الٰہیات اور اصل کائنات کی بابت سب سے بہتر علم شاعروں ہی کے یہاں ملتا ہے۔ عیسائی دینیات دانتے کی نظم سے زندہ ہیں۔ اسلامی دینیات اور فلسفہ رومی اور اقبال کی وجہ سے دلوں کو گرماتا ہے۔ اقبال نے شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا ہے۔ شاعر یا ادیب قوم ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ان کی آنکھیں کھولنے کا سرمایہ بہم پہنچاتا ہے۔ براؤننگ کے اشعار کائنات کی تنظیم کی بابت جس طرح ہماری آنکھیں کھولتے ہیں۔ اس طرح کوئی فلسفی اس کام میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

HAVE I KNOWLFGE, CONFOUNDED IT

SHRIUELS AT WISDOM LAIDBARE

HAVE I FORE THOUGH HOW PURBLIND, HOW

BLANK TO THE INFINITE CARE

سائنس اور علوم ہمیں کائنات کی سیر ہی کرا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر شاعر کہتا ہے:۔

قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں   ترا جہاں مہ و پرویں سے ہے بہت آگے

علوم اس کے لیے محلے سنگ وخشت میں اور وہ ان سے بے نیاز ہو کر ہمیں بتاتا ہے۔

ترا جہاں ہے وہی تو جسے کرے پیدا
یہ سنگ وخشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

شاعری ہی نہیں بلکہ ہر اعلیٰ ادبی چیز ہمیں اس دنیا کی مکمل تصویر دکھاتی ہے جو علوم نے خرد سے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھی ہے۔ ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" روس کی نپولین سے لڑائی کے منظر میں ہمارے لیے یورپ کے تمام فلسفی تاریخ وسیاست وغیرہ کا منظر سامنے لاتی ہے۔ ناول محض دلچسپ قصہ سے بڑھ کر علوم کا سرچشمہ اسی طرح ہو جاتی ہے، جیسے شاعری محض خوبصورت الفاظ کے کھیل سے بڑھ کر رازِ کائنات کی تصویر کشی بن جاتی ہے۔

اسلام کا معاشی نظریہ :- از مولانا مظہر الدین صدیقی

عہد جدید کے معاشی مسائل پر اسلام کے ان بنیادی اور دائمی اصولوں کا اطلاق جس پر عہد رسالت کے تفصیلی اور فروعی احکام مبنی تھے۔

صفحات ۱۰۹ — ۱/۷۵ روپے

مسئلہ زمین اور اسلام :- از پروفیسر محمود احمد

اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب۔

صفحات ۲۳۴ — ۴/۲۵ روپے

تعلیماتِ غزالی :- از مولانا محمد حنیف ندوی

فقہ وتصوف میں کیا تعلق ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے تصوّف کا کیا مقام ہے؟ نیز اس نیز اس کی اصطلاحیں کن معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب۔

صفحات ۵۷۲ — ۱۰ روپے

ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ لاہور